ایک علمبردارِ حریت کے نمایاں کارنامے اور بے لوث خدمات

از حکیم عزیز الرحمٰن (رفیق) اعظمی عمری طبیب کامل، عمرآباد

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں یُوں تو بہت سے فرزندانِ ملک و قوم نے مادرِ وطن کی خدمت گذاری میں جانی اور مالی قربانیاں پیش کی ہیں اور اس کا خاطرخواہ صلہ بھی انہیں ملا ہے، مگر انہی مجاہدین میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کی بے لوث اور بے غرض خدمات جنگِ آزادی کے لئے وقف رہیں اور ان کا واحد مقصد حصولِ آزادی تھا۔

چنانچہ ایسے ہی لوگوں میں مجاہدِ جلیل حضرت مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب صواتی متعنا اللہ بطول بقائہ کی ذاتِ گرامی بھی ہے، آپ نے جنگِ آزادی میں اپنا تن، من، دھن سبھی کچھ تو قربان کردیا۔ کون سی کلفتیں تھیں جو آپ نے نہیں اُٹھائیں اور کون سی صعوبتیں تھیں جو آپ نے برداشت نہیں کیں۔ اور کمال تو یہ ہے کہ آپ کی یہ ساری قربانیاں کسی ذاتی غرض یا حصولِ منفعت کے لئے نہیں تھیں بلکہ آپ کا واحد مقصد حصولِ آزادی تھا اور بس، آپ بدیسی حکومت کا خاتمہ اور دیسی حکومت کو برسرِاقتدار دیکھنا چاہتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے آپ سے سوال کیا کہ جب آپ کا حصولِ آزادی کا خواب پورا ہوگیا اور دیسی حکومت قائم ہوگئی تو آپ نے کیوں حکومت میں حصہ نہیں لیا حالانکہ آپ چاہتے تو اپنی خدمات کے صلے کے طور پر حکومت میں نمایاں مقام حاصل کرسکتے تھے، حضرت حکیم صاحب نے ہنس کر یہ شعر پڑھا ؎

ملک آزادگی و کنجِ قناعت گنجیست ؛ کہ بہ شمشیر میسر نہ شود سلطاں را

پھر فرمایا کہ جنگِ آزادی میں حصہ لینے سے پہلے دل میں نہ ایسا کوئی خیال تھا نہ حصولِ آزادی کے

بعد اس قسم کی کسی خواہش نے ذہن میں سر ابھارا - اس تحریک میں شرکت کے سلسلے میں بس ایک ہی مقصد کارفرما تھا اور وہ تھا اپنے عزیز ملک کو غیروں کے پنجے سے چھین کر اسے آزاد کرانا۔ اس سے زیادہ کی نہ پہلے خواہش تھی نہ اب ہے - اب جبکہ یہ مقصد حاصل ہو گیا تو خواہ مخواہ حکومت میں ٹانگ گھسیڑنے کو میں ایک قسم کی خود غرضی سمجھتا ہوں، میرے لئے یہی سرمایۂ قناعت اور گوشۂ گمنامی بہت ہے، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے ایسا آزاد اور شریف پیشہ بخشا ہے جس سے گذر اوقات ہو جاتی ہے اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے۔

ہماری حکومت نے مجاہدین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مختلف جائدادیں زمینیں وغیرہ الاٹ کی تھیں مگر مجھے یہ جان کر سخت تعجب ہوا کہ حضرت حکیم صاحب کو حکومت نے اس سے بھی محروم ہی رکھا، میرے استفسار پر حکیم صاحب نے فرمایا کہ آزادی کے ایک سال بعد دوست احباب نے حکیم صاحب سے بھی کہا کہ آپ کلکٹر کو ایک درخواست بھیج دیجیے جن لوگوں نے ملک و قوم کے تحفظ کے لئے جانی اور مالی قربانیاں پیش کی ہیں اور جیل وغیرہ کی صعوبتیں برداشت کی ہیں حکومت انہیں زمینیں الاٹ کر رہی ہے مگر حکیم صاحب کی غیرت نے اسے گوارہ نہیں کیا اور آپ نے درخواست بھیجنے سے انکار کر دیا، آخر خود دوست احباب نے اپنے طور پر کلکٹر کے پاس درخواست بھیجدی، کلکٹر کی طرف سے تحقیقات کے بعد حکیم صاحب کے نام پانچ ایکڑ زمین کا پٹہ کر دیا گیا لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ زمین میں کچھ تاڑ کے درخت ہیں ان کی قیمت سات سو روپیہ بطور نقد ادا کرنی ہوگی، حکیم صاحب نے کہا اس کا کیا مطلب ہے کہ زمین تو دی جائے اور درختوں کی قیمت وصول کی جائے - اگر دینا ہی ہے تو درختوں سمیت دی جائے ورنہ مجھے ایسی زمین کی ضرورت نہیں میں یہ زمین حکومت ہی کو واپس دے رہا ہوں، چنانچہ آپ نے زمین واپس کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کی خدمات کسی غرض یا لالچ پر مبنی نہیں تھیں، اسی لئے حکیم صاحب کو زمین کے ملنے پر نہ کوئی خوشی ہوئی نہ زمین کے چھن جانے کا کوئی رنج یا افسوس ہوا۔

میں اپنے اس مضمون میں اسی عظیم المرتبت شخصیت کے کچھ حالاتِ زندگی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں آپ کا وطن تھانہ سوات، ایجنسی مالاکنڈ پشاور ڈویژن ہے، عرصۂ دراز سے آپ آمبور ضلع شمالی آرکاٹ میں

مقیم ہیں۔ نہم شوال ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء چہار شنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی تھی۔

جنگِ عمومی کے موقعہ پر ہندوستان کے مسلمانوں خاصکر مذہبی طبقے میں انگریزی حکومت کے خلاف خفیہ تحریک شروع ہوئی تھی جس کے سرگروہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی تھے، آپ تو حجاز تشریف لے گئے اور آپ کے شاگرد مولانا عبید اللہ صاحب سندھی براہِ کوئٹہ بلوچستان قندھار چلے گئے، اس سلسلہ میں حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی، پشاور تشریف لے گئے، اور حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی کو جو کہ بہت با اثر بزرگ تھے جن کے صوبہ سرحد اور قبائل میں لاکھوں مرید تھے، انگریزوں کے خلاف آمادہ جہاد کر دیا۔ اس تحریک میں حکیم صاحب بھی شریک ہوئے، اور حاجی صاحب موصوف کے ساتھ براہِ سودم بونیر کی طرف چلے گئے اور وہاں کے باشندوں کو انگریزی حکومت کے خلاف جہاد پر آمادہ کرنے لگے چنانچہ تین معرکے ہوئے پہلے دو معرکوں میں تو انگریزی فوج کو سخت نقصان پہونچا یا بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سامانِ حرب بطور مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ انگریزی فوج کے جنرل نے جب دیکھا کہ مجاہدین کا پلہ بھاری ہے اور اس طریقہ سے مجاہدین کو شکست نہیں دی جا سکتی تو دوسرا طریقہ اختیار کر لیا، بونیر کے سربرآوردہ لوگوں کو روپیہ پیسہ دے کر اپنا تابع بنا لیا چنانچہ تیسرے معرکے میں یہ لوگ جہاد میں شریک نہیں ہوئے اس طرح مجاہدین کی تعداد بہت کم رہ گئی اس لئے مجاہدین کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی بہت زخمی اور شہید ہو گئے آخر کار مجاہدین کو شکست ہو گئی۔

حضرت حاجی صاحب نے جب اہالیانِ بونیر کا یہ رویہ دیکھا تو وہاں سے باجوڑ اور مہمند کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں جہاد کا علم بلند کر دیا۔ تین چار مہینہ تو خوب جہاد کیا اور انگریزی فوج کو بہت نقصان پہونچایا، بہت سارا اسلحہ بھی ہاتھ لگا۔ یہاں بھی انگریزی حکومت نے اپنی پرانی پالیسی کے مطابق روپیہ بہانا شروع کر دیا اور مجاہدین کو جہاد سے باز رکھنے کی کوشش شروع کر دی، آخری معرکے میں انگریزی فوج کے جنرل کا اے ڈی کانگ زندہ گرفتار کر لیا گیا، اس کی گرفتاری سے مجاہدین کو بہت بڑا فائدہ پہنچا، حضرت حاجی صاحب کے بہت سے مریدین اور معتقدین کو جو ضلع پشاور میں تھے گورنمنٹ نے حاجی صاحب کے چلے جانے اور گورنمنٹ کے خلاف جہاد کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے قید کر دیا اور ان پر بڑی سختیاں

ہو رہی تھیں، چنانچہ جب ایڈیکانگ کو غازیوں نے گرفتار کر لیا تو حاجی صاحب نے جنرل کو لکھا کہ گورمنٹ اگر ہمارے قیدیوں کو رہا کردے تو ہم ایڈیکانگ کو آزاد کر کے تمہارے پاس بھیج دیں گے، جنرل نے یہ تجویز منظور کر لی اور خود جا کر فرانٹیر کے چیف کمشنر سے اجازت لے کر تمام قیدیوں کو رہا کرادیا، ادھر ایڈیکانگ کا رویہ اچانک بدل گیا، وہ اسلام کی طرف راغب ہو گیا، اسلام کے اصول و احکام سے بھی بخوبی واقف ہو گیا تھا، کلمہ بھی پڑھتا تھا اور اسے غازیوں کے ساتھ رہنا بھی پسند تھا۔ لوگ اس کے یہ اعمال و عواطف دیکھ کر اس کی بڑی عزت کرنے لگے، ایڈیکانگ واپس جانے پر بالکل آمادہ نہ تھا، لیکن حاجی صاحب کو اپنے مریدین کا بڑا خیال تھا وہ کہنے لگے کہ جب صرف ایک آدمی کے عوض میں ہمارے کم و بیش سو قیدی رہا ہو سکتے ہیں تو ایسے موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا دانش مندی کے خلاف ہوگا۔ اور انھوں نے ایڈیکانگ کو زبردستی واپس بھیج دیا، اس کی وجہ سے غازیوں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا کیونکہ بعض لوگ ایڈیکانگ کو واپس بھیج دینے کے حق میں تھے اور بعض اس کے خلاف، ایڈیکانگ نے اپنے لئے اسلامی نام محمد علی تجویز کر لیا تھا غازیوں کو بھی یہ نام بہت پسند آیا تھا۔ وہ اُردو لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے، اور پشتو سے بھی بخوبی واقف تھے، حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو بھی حاجی صاحب کا یہ رویہ پسند نہیں آیا۔ اس لئے انھوں نے بھی حاجی صاحب سے علیحدگی اختیار کر لی اور افغانستان تشریف لے گئے، ان کے ساتھ حکیم صاحب بھی روانہ ہو گئے کیونکہ حکیم صاحب بھی حاجی صاحب کے فیصلے کے خلاف تھے، افغانستان کے صوبہ سمت مشرقی کے صدر مقام جلال آباد میں کم و بیش ایک ماہ مقیم رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب کے اہل و عیال ریاست ٹونک میں تھے۔ جب مولانا جہاد سے فارغ ہوئے تو انہیں اپنے پس ماندگان کا خیال آیا۔ حکیم صاحب سے کہا کہ میرے بیوی بچے ٹونک میں ہیں، جب سے میں دہلی سے نکلا ہوں ان کے حالات سے بے خبر ہوں۔ تم وہاں پہنچ کر ان کے حالات سے مجھے باخبر کرو، خرچ اخراجات کے لئے چار آدمیوں کے نام اور پتے بتا دیئے اور کہا کہ ان سے ملاقات کر کے حالات سے مطلع کر دو اور جو کچھ وہ دیں ٹونک پہنچ کر بیوی بچوں کے حوالے کر دو، چنانچہ حکیم صاحب یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو جلال آباد سے روانہ ہوئے اور غیر معروف پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے خفیہ طور پر ۲ دسمبر کو دلی پہنچے، سب سے پہلے

خان بہادر عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی سے ملے اور مولانا کا سلام و پیام پہنچا دیا۔ عبدالاحد صاحب نے چار سو روپے حکیم صاحب کے حوالے کیے، وہاں سے حکیم صاحب جے پور گئے، وہاں ایک شخص سے ملاقات کرکے دو سو روپے حاصل کیے، پھر ٹونک پہنچ کر یہ چھ سو روپے مولانا کے بال بچوں کے حوالے کر دیئے، واقعی وہ لوگ بڑی تکلیف میں مبتلا تھے، پھر وہاں سے بمبئی روانہ ہوئے کیوں کہ وہاں کے دو آدمیوں کا نام بھی مولانا نے بتایا تھا۔ ان سے ملاقات کرکے پوری سرگزشت سنائی، اول اول تو وہ لوگ کچھ جھجکے اور تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کہہ دیا کہ مولانا سیف الرحمٰن صاحب سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ دوسرے ذرائع سے جب انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی حکیم صاحب مولانا سیف الرحمٰن صاحب کے فرستادہ ہیں تو انھوں نے گیارہ سو روپیہ حکیم صاحب کے حوالے کرکے کہا کہ اس میں سے ہزار روپے مولانا کے بال بچوں کے لئے ہیں اور باقی ایک سو تمہارے لئے زادِ راہ، بمبئی کے دورانِ قیام ہی میں حکیم صاحب کو پتہ چلا کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء کو بمبئی میں لیگ اور کانگریس کے اجلاس منعقد ہو رہے ہیں۔ اس وقت لیگ کے صدر جناب مظہر الحق صاحب بانکی پور پٹنہ، اور کانگریس کے صدر آنریبل مسٹر سنہا (جو ایک سال بعد لارڈ سنہا بن گئے) تھے، یہ دونوں حضرات ایک ہی ٹرین سے بمبئی پہنچے، حکیم صاحب بھی استقبال کو گئے اور دونوں اجلاس میں شریک رہے۔ یہ گویا کانگریس سے آپ کی پہلی دل چسپی تھی، اس روز سے آج تک کبھی کانگریس سے الگ نہیں ہوئے، مذکورہ اجلاس سے فارغ ہو کر یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو بمبئی سے ٹونک روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر ہزار روپیہ مولانا کے بال بچوں کے حوالے کر دیئے اور وہاں سے حیدرآباد دکن روانہ ہو گئے اور وہاں کے ایک دور دراز گمنام مقام میں نام تبدیل کرکے اقامت پذیر ہوئے تاکہ گورنمنٹ کو ان کے مجاہد ہونے کا علم نہ ہو سکے ورنہ گرفتار ہو جانے کا ڈر تھا۔ بورگم پہاڑ میں ۱۵ جنوری سے ۲۱ جولائی ۱۹۱۷ء تک مقیم رہے، پھر گورنمنٹ کیمونک شائع ہوئی کہ جو لوگ مہمند اور باجوڑ کے معرکوں میں شریک رہے تھے ان سب پر اب کوئی پابندی نہیں ہے وہ آزادی کے ساتھ انگریزی علاقہ میں آ جا سکتے ہیں، یہ کیمونک شائع ہوتے ہی آپ اپنے وطن سوات چلے گئے، وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد علی صاحب قصوری ایم، اے کنٹب پرنسپل حبیبیہ کالج کابل نے

کابل چھوڑ کر آزاد قبائل میں بمقام چمر کنڈ بودو باش اختیار کرلی ہے اور جہاد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ سنتے ہی حکیم صاحب کے دل میں بھی گدگدی پیدا ہوئی اور چمر کنڈ جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن والد صاحب نے روک دیا کیونکہ والدہ صاحبہ کا مزاج ناساز تھا، والد صاحب نے کہا کہ میں بھی عنقریب کوہاٹ جانے والا ہوں ایسی صورت میں گھر میں تمہارے سوا کوئی نہیں رہے گا، چونکہ والدین کی اجازت کے بغیر کسی بھی جہاد میں شرکت کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے آپ رک گئے، ایک ماہ بعد والد بزرگوار کوہاٹ چلے گئے اور والدہ صاحبہ کا مزاج بھی قدرے سنبھل گیا تو آپ چمر کنڈ چلے گئے اور مولانا محمد علی صاحب قصوری سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ مولانا دو مرتبہ انگریزی فوج سے نبرد آزما ہوئے ہیں لیکن زڑہ ور خان چونکہ ایک مقامی آدمی تھا اور بہت بااثر اس سے مجاہدین کو ہر طرح کی مدد مل رہی تھی اس کو انگریزوں نے کثیر رقم دے کر اپنا تابع بنا لیا اور وہ جب جہاد سے رک گیا تو مولانا کی کمر ٹوٹ گئی، اتنے میں انگریزی فوج کے جنرل کے ایڈیکانگ کا خط مولانا محمد علی صاحب کے نام آیا اس نے لکھا تھا کہ اب ہتھیار رکھ دو کیونکہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور انگریز فتح مند ہو گئے ہیں، جرمنی نے شکست کھائی ہے۔ اب اگر آپ جہاد کا اقدام کریں گے تو ہماری فوج پوری طاقت اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہو جائے گی اور آپ اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکیں گے، زڑہ ور خان نے بھی آپ کی امداد و اعانت سے ہاتھ روک لیا ہے، ایسی صورت میں آپ کو اور بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس خط نے مولانا محمد علی صاحب کو تشویش اور پریشانی میں مبتلا کر دیا، آپ کے ساتھی بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے، یہ حالت دیکھ کر حکیم صاحب کو یقین ہو گیا کہ اب جہاد نہیں ہوگا، اس لئے وہاں سے واپس سوات چلے گئے۔

جنگ عمومی میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا جرمنی کی شکست گویا ترکی کی بھی لازمی شکست تھی۔ ترکی کی شکست کے باوجود وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے اول اول اعلان کر دیا کہ ترکی کو اپنے وطن اور اقتدار سے محروم نہیں کیا جائیگا، پھر بہت جلد اپنے قول سے پھر گئے اور اعلان کر دیا کہ ترکی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے گا، اسی کی وجہ سے جنگ نے طول کھینچا تھا، ورنہ جرمنی کب کا شکست کھا چکا تھا۔ اس اعلان کے بعد ہی انگریزی بیڑہ قسطنطنیہ پر قابض ہو گیا اور خلیفۃ المسلمین کو گرفتار

کرکے نظربند کر دیا گیا، اس سے مسلمانانِ عالم میں سخت انتشار اور بے چینی پیدا ہو گئی خاص طور پر مسلمانانِ ہند اس سے زیادہ متاثر اور پریشان ہوئے اور انگریزی حکومت کے خلاف احتجاج کرنے لگے، دسمبر ۱۹۱۸ء کے آخر ہفتہ میں دہلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقد ہونے والے تھے، ان اجلاس میں شرکت کی غرض سے حکیم صاحب قبلہ بھی سوات سے دہلی تشریف لائے، اور کانگریس اور لیگ کے دونوں اجلاس میں شریک ہوئے، کانگریس کے صدر مدن موہن مالویہ تھے اور لیگ کی صدارت کے فرائض مولوی فضل حق شیرِ بنگال کے ذمّے تھے، لیگ کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر جناب ڈاکٹر انصاری صاحب تھے، انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسئلۂ خلافت کو بھی چھیڑا اور خلیفۃ المسلمین کی نظربندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور دلائل سے ثابت کیا کہ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لئے آزاد اور خودمختار خلیفۃ المسلمین کی اشد ضرورت ہے، اس بارے میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مسلمانانِ ہند کو احتجاجی جلسے منعقد کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اجلاس میں ایک رزولیشن بھی پاس کیا گیا تھا کہ ہر جگہ اور ہر صوبے میں اس تحریک کو جاری رکھا جائے اور وقتاً فوقتاً احتجاجی جلسے منعقد کرائے جائیں، چنانچہ اس تحریک کو عام کرنے کے لئے تمام صوبجات کو سفراء بھیجے گئے، مولانا عرفان صاحب نے صوبۂ مدراس کے لئے حکیم صاحب کو نامزد کیا اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے حکیم صاحب کی سفارش کی، کیوں کہ حکیم صاحب ۱۹۱۷ء میں ندوۃ العلماء کے جلسے میں شرکت کے لئے اورنگم پہاڑ سے مدراس گئے تھے، اس اجلاس میں شرکت کی وجہ سے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے تعارف ہو گیا تھا، مولانا عرفان صاحب کو حکیم صاحب کے جہادی کارناموں کا بھی بخوبی علم تھا اس لئے مولانا نے قاضی عبدالغفار صاحب کی معیت میں ڈاکٹر صاحب سے حکیم صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے حکیم صاحب کو بھیجنا منظور کر لیا اور جناب سیٹھ یعقوب حسن صاحب کے نام ایک خط دیا اور اپنے خطبۂ صدارت کی پچاس کاپیاں بھی حوالے کر دیں کہ وہاں پہنچ کر اس کی اشاعت کی جائے، ۵ جنوری ۱۹۱۹ء کو حکیم صاحب مدراس کے لئے روانہ ہوئے اسی دن گورنمنٹ نے ڈاکٹر صاحب کے خطبۂ صدارت کی ساری کاپیاں ضبط کر لیں صرف وہی کاپیاں بچ رہیں جو حکیم صاحب اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

مدراس پہنچ کر حکیم صاحب نے سیٹھ یعقوب حسن صاحب سے ملاقات کی اور ڈاکٹر صاحب کا خط اور خطبۂ صدارت کی کاپیاں ان کے حوالے کردیں، سیٹھ صاحب خطبۂ صدارت کی کاپیاں پاکر بہت خوش ہوئے کیونکہ انہیں اخبارات سے پتہ چل گیا تھا کہ خطبۂ صدارت کی کاپیاں ضبط کی جاچکی ہیں، چنانچہ اسی وقت گاڑی منگوائی اور خود جگہ جگہ پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے اس کی تقسیم کی، دوسرے روز جلسے کا اعلان کردیا گیا۔ ٹون ہال میں دوسرے دن جلسہ ہوا لوگ بڑی کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور خلافت کی تحریک شروع ہوگئی، اس تحریک میں مولانا عبدالمجید صاحب شرر آلندوری ایڈیٹر روزنامہ "قومی رپورٹ" سب سے پیش پیش تھے، شرر صاحب نے رائے پیش کی کہ حضرت حکیم صاحب کو شہر سے باہر کہیں رکھا جائے تاکہ یہ تحریک مدراس سے باہر بھی خوب پھیل جائے، چنانچہ آمبور کے ایک رئیس ٹی، عبداللہ صاحب نے حکیم صاحب کو آمبور بلا لیا اور ان کے واسطے ایک شفاخانہ بھی قائم کردیا۔ تاکہ علاج معالجہ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ انہی دنوں اتفاق سے ایک شخص سوات سے آمبور آیا اس کی زبانی معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کی اہلیہ محترمہ کا جو کہ سوات میں تھیں انتقال ہوگیا، یہ خبر سن کر حکیم صاحب نے سوات جانے کی آمادگی ظاہر کی، جناب شرر صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے ٹی عبداللہ صاحب کو لکھا کہ حکیم صاحب کو ہر قیمت پر وطن جانے سے باز رکھا جائے بہتر ہوگا اگر ان کی شادی وہیں آمبور یا قرب وجوار میں کردی جائے اس طرح یہ ادھر کے ہوکر رہ جائیں گے، انہی کے دم قدم سے یہاں خلافت کی تحریک شروع ہوئی ہے اور اس تحریک کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے ان کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے چنانچہ لوگوں کے شدید اصرار کے پیش نظر حکیم صاحب نے اپنے وطن جانے کے پروگرام کو ملتوی کرکے آمبور ہی میں رہنا منظور کرلیا، پھر ٹی، عبداللہ صاحب کی مسلسل کوششوں اور اصرار نے حکیم صاحب کو شادی کرلینے پر بھی آمادہ کرلیا۔ اور گرڈھ آمبور (عمر آباد سے متصل ایک تاریخی مقام ہے) کے ایک ذی عزت اور اچھے خاندان میں شادی کرادی، آمبور میں جب خلافت کی تحریک زور پکڑ چکی تو وانمباڑی کے لوگوں نے حکیم صاحب کو اپنے یہاں بلا لیا پھر آپ نے وہیں مستقل طور پر بود و باش اختیار کرلی وانمباڑی میں آپ نے "خلافت پبلسٹی بورڈ فار سدرن انڈیا" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کی

صدارت کے فرائض آپ کے ذمہ تھے، اور جناب خالص صاحب سکریٹری مقرر ہوئے، اس ادارے کی بدولت سارے تامل ناڈ میں خلافت کی تحریک پھیل گئی، اور لوگ انگریزی حکومت کی ناانصافی اور لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی سے بخوبی واقف ہو گئے اور اظہارِ تنفر کے طور پر ہر جگہ احتجاجی جلسے ہونے لگے، ان کارروائیوں کو دیکھ کر حکومت کو یقین ہو گیا کہ حکومت کی اس مخالفت کا اصلی سبب صرف حکیم صاحب کی ذات ہے، اس لئے حکیم صاحب کو گرفتار کرنے کا باقاعدہ انتظام ہو گیا، چنانچہ ۴ ار مارچ ۱۹۲۲ء کو انہیں گرفتار کر کے تمپاتور کے سب کلکٹر کے سامنے پیش کیا گیا، لوگوں نے وکیل رکھنے کی کوشش کی مگر حکیم صاحب نے منع کر دیا اور کہہ دیا کہ مجھے انگریزی حکومت سے انصاف کی کوئی توقع نہیں ہے اس لئے میں مقدمے کی پیروی نہیں چاہتا ایسی صورت میں وکیل رکھنا نہ رکھنا سب برابر ہو گا۔ سی، آئی، ڈی اور پولیس انسپکٹر نے حکیم صاحب پر جب الزامات لگائے تو کلکٹر نے پوچھا کہ ان بیانات کے بارے میں آپ کو کچھ کہنا ہو تو کہہ سکتے ہو، کلکٹر انگریز تھا حکیم صاحب نے کہہ دیا کہ بیان تو میں نہیں دوں گا البتہ دو ایک باتیں ضرور کہنی ہیں اور وہ صفائی یا برارت سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ مافی الضمیر کا اظہار ہے۔ حکیم صاحب نے کہنا شروع کیا کہ ۶ ر مارچ ۱۹۲۲ء کو کراچی جیل میں مولانا محمد علی صاحب حالتِ نماز میں تھے کہ انہیں ننگا کر کے تلاشی لی گئی تھی، اسی طرح ۷ ر مارچ کو ہزاری باغ کی جیل میں ایک وکیل صاحب تلاوتِ قرآن پاک کر رہے تھے کہ جیلر نے ٹھوکر مار کر قرآن مجید کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اس کے خلاف ہر جگہ احتجاجی جلسے ہو رہے ہیں، ہم نے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے وانمباڑی میں جلسہ کیا اور میں نے جیل کے عملے کی ان دراز دستیوں پر خوب لعن طعن کیا اور اسی جرم میں گرفتار کر کے لایا گیا ہوں۔ اب مجھے آپ لوگوں کو یہ سنانا ہے کہ میرے پاس بھی مصلیٰ اور قرآن مجید دونوں موجود ہیں میں جیل میں پنجگانہ نماز پابندی سے ادا کروں گا اور حسبِ خواہش تلاوت بھی کرتا رہوں گا، خوب کان کھول کر سُن لو اگر کسی نے جیل میں میرے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنا چاہا جس طرح مولانا محمد علی اور وکیل صاحب کے ساتھ کیا گیا ہے یعنی اگر کسی نے حالتِ نماز میں یا تلاوت کرتے وقت مجھے چھیڑنے کی کوشش کی یا میری تلاشی لینے کی جسارت کی تو میں اسے قتل کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ حتی الامکان میری یہی کوشش ہوگی کہ اس آدمی کو جان سے مار دوں۔ حکیم صاحب کے اس جرأت مندانہ بیان سے حاضرین پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

مقدمے کی پیروی دیکھنے کی غرض سے دانمباڑی کے کوئی پچاس ساٹھ آدمی بھی ساتھ گئے تھے، وہ لوگ حکیم صاحب کی اس بیباکی پر حیران اور ششدر رہ گئے، ساتھ ہی آپ کی غیرتِ ایمانی اور جرأتِ حق گوئی سے بے حد متاثر اور مسرور ہوئے۔ کلکٹر چونکہ اردو زبان سے ناواقف تھا اس لئے حکیم صاحب کی دھمکی سمجھ نہیں سکا اور سرکاری وکیل سے دریافت کیا کہ مجرم کیا کہہ رہا ہے، سرکاری وکیل نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کہہ دیا کہ یوں ہی اِدھر اُدھر کی ہانک رہا ہے، اس پر حکیم صاحب نے وکیل کو للکارا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ من وعن کلکٹر کے گوش گذار کردو۔ مجبوراً وکیل کو وہ سب باتیں کلکٹر کے روبرو دہرانی پڑیں۔ یہ باتیں سن کر کلکٹر بھی کچھ دیر کے لئے سکتے میں آگیا، وہ بھی حکیم صاحب کی اس جسارت سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، اس کا بس اگر چلتا تو حکیم صاحب کے لئے سخت سے سخت سزا تجویز کرتا مگر چونکہ وہ سب کلکٹر تھا اور ایک سال سے زیادہ کی سزا دینے کا مجاز نہیں تھا اس لئے بادلِ ناخواستہ ایک سال قیدِ بامشقت کی سزا سنادی، ساتھ ہی ججمنٹ میں یہ اسپیشل نوٹ بھی تحریر کردیا کہ یہ شخص سخت خطرناک ہے، اس لئے جیل میں نہ کبھی نماز پڑھتے وقت اس کی تلاشی لی جائے اور نہ تلاوت کے وقت کوئی ان کے قریب جائے۔ اس نوٹ کا خاطر خواہ فائدہ ہوا کہ کبھی آپ کے کمرے میں جیلر گیا نہ سپرنٹنڈنٹ نہ ہی کسی نے آپ کو نماز پڑھنے یا تلاوت کرنے سے روکا۔ آپ برابر روزانہ تین پارے قرآن شریف پڑھا کرتے تھے، اس نوٹ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جیل کے ساتھیوں میں سے جس کسی کے پاس کوئی خط یا کوئی خفیہ چیز آتی تو وہ سب لاکر حکیم صاحب کے کمرے میں رکھ دی جاتیں اس طرح وہ تلاشی سے محفوظ رہ جاتیں،

(باقی)

سرکشیٔ ضلع بجنور

مصنفہ: سید احمد خاں صدر امین بجنور
مرتبہ: شرافت حسین مرزا (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی)

"سرکشیٔ ضلع بجنور" سرسید احمد خاں کے ذہنی ارتقاء کی گزرگاہوں میں ایک نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی اہمیت نہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ یہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ضلع بجنور کے تاریخی رول کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز ہے، بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے اس تاریخی جدوجہد میں انگریزوں کی حمایت کس نقطۂ نظر سے کی تھی، اور ایسا کرنے سے ان کا کیا منشا تھا۔ شرافت حسین مرزا صاحب نے جو خود بھی ضلع بجنور کے مردم خیز خطے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کتاب کی ترتیب میں جس نگاہِ تحقیق سے کام لیا ہے اس کا اندازہ مقدمہ سے ہوتا ہے، کتاب کے متن کی تصحیح کے علاوہ اس کی زبان وبیان سے بھی بحث کی گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس ذہنی پس منظر کو اجاگر کیا گیا ہے جس میں سرسید نے اس کتاب کو تصنیف کیا۔

ناشر
مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی